ان پانی کپڑے لتے اور رہت رہائش کی ہر مہینے کی چودھویں تاریخ کو جا کر آپ پڑتال کرتا۔ جس شے کی ضرورت ہوتی کاغذ پر لکھ کر ساتھ لے جاتا اور حویلی سے اپنی بکھی میں یا گڈ میں رکھوا کر فوراً بھجوا دیتا۔ سارے بردے غلام' تیلی نائی' موچی بھرائی' کمہار چمار' میرے جیسے ترکھان لوہار' سائیس لانگری چوکیدار' ماشکی جھیور سارے اس کو دن رات سیس دیتے تھے اور اس کے جس گاتے تھے۔

لو جناب ایک ہی ایک سردار کا بیٹا اور چھ سو مربع زمین۔ ہتھیلی جیسے کھیت' ہریاں کالیاں چپلیاں' سب آباد سب شاداب' اپنے موگے اپنا سوا' اپنے ناکے' چھے چھے انچ بور کے باروٹیوب ویل (یہاں سے مستری دان سنگھ قصہ گو نیا اور پرانا زمانہ ایک کر دیتا) دس ٹریکٹر سولہ ٹرالیاں' دو تھریشر' سو اوپر بیس جوڑیاں ناگوری اور دھنی بیلوں کی۔ پچاس گڈے' ستر ہل' ایک اصطبل دیسی گھوڑوں کا ایک میں ولایتی ریس کے گھوڑے' پچاس بھینسیں کالی بھوری راوی پار کے علاقے کی اور بیس گائیں ولایتی جن کے اوپر گورے نوکر مشینوں کے ساتھ دودھ نکالیں اور ایک ایک گائے من من سوا سوا من دودھ دے۔ چار ولایتی موٹریں ایک جرمن لینڈ وگاڑی۔ یہ اگلے زمانے کی بات ہے اس وقت ایسی ہی گاڑیاں ہوتی تھیں لینڈو اور کھلی چھت والی..... حویلی کے اندر باہر چاروں طرف باغ ہی باغ' میوے ہی میوے' بلبلوں' لالیوں' موروں چکوروں سے بھرے باغیچے' ہرنوں' چیتلوں پاڑھوں اور بھگیاڑوں سے بھرے رکھ اور جنگل۔ بڑا زمانہ تھا۔ بڑا سمان تھا۔ اچھے لوگ تھے' بھاگوان راجے صبر مند رعایا۔ شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے پر یہ اگلے زمانوں کی بات ہے جب ابھی کل جگ کا راج نہیں آیا تھا۔

لو جناب! ایک ہی ایک سردار کا بیٹا۔ سوھنا اور من موھنا۔ دیکھے سے بھوک مٹے درشن کرنے سے روگ کٹے۔ چلے تو ایسے ساون بھادوں کی پھوار اترے۔ بات کرے تو پھول پنکھڑیوں سے دھرتی بھر جائے۔ ہنسے تو اس کی آواز سے اندھیرے گھروں میں چانا ہو جائے۔ علم کا ایک مہاساگر کہ بڑے بڑے گیانی ودوانی اس سے سبق لینے آئیں۔ دیالو اپنے باپ جیسا اور سلکھنا اپنی ماں سے بھی دو قدم آگے۔ بڑے شہر کے بڑے کالج میں پڑھتا تھا۔ بڑی بڑی گوری میمیں اس سے اکھ مٹکا لگانے کی خواہش مند پر وہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ سیدھا کالج جائے اور کالج سے واپس اپنی کوٹھی آ جائے جو اس کے باپ نے خاص طور پر آٹھ کنال کے اندر اس کو بنوا کر دی تھی۔ اندر نائی' دھوبی' اندر ہی بیرے

خانسامے 'اندر ہی اشنان کرنے کا تالاب اور اندر ہی گیند بلا کھیلنے کا میدان۔ وہ جس کسی کو ملنا ہو باہر ڈیوڑھی پر نام لکھائے پرچی کٹوائے ٹیلیفون پر آواز لگائے پھر اندر جائے۔

لو جناب! گرمیوں کی چھٹیوں میں ایک بار جب سردار زادہ شہزادہ گھر واپس آیا تو سارے علاقے میں ڈھول بجے شہنائیاں کوکیں۔ رات کو آتش بازی چلی' سو دیگیں چاولوں کی چالیس دال کی اور ساٹھ دیگیں میٹھے چاولوں کی پکیں۔ دور دور کے غریب غربا کھیسوں چوھیوں میں گٹھڑیاں باندھ کر پوش پوش کرتے اپنے اپنے گاؤں لے گئے۔ خود بھی کھایا دوسروں کو بھی کھلایا۔ روزے رکھے بغیر ہی عیدیں ہو گئیں۔

لو جناب! ایک دن کرنا واہگورو جی سرکار کا کیا ہوا کہ صاحبزادہ کتاب لے کے حویلی کے باغیچے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ اس کی نظر سامنے پڑی۔ ایک چھوٹے سے کچے پکے گھر کے برآمدے میں ایک لڑکی سولہ سترہ سال کی کچے پٹ کی پھلکاری باندھے اور ململ کی کرتی پہنے صاحبزادے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چوپڈے بھرے بھرے گول' سینہ ابھرا ہوا۔ گردن میں سیپ کے چھلکوں کا گلوبند لیکن آنکھ میں ٹیڑھ۔ دانتوں کے درمیان چوڑی ورل اور ماتھے کے اوپر بائیں طرف ایک مسہ۔ صاحبزادہ اس مورتی کو دیکھ کر پڑھنا پڑھانا بھول گیا۔ کتاب گودی سے نکل کر گھاس پر گر گئی۔ اینڈی پن کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پران آنکھوں میں آ گئے۔ اپنی جگہ سے اٹھا۔ پیر بوٹوں میں ڈالے تسمے کھلے چوڑ دیئے اور سیدھا مورتی کی طرف یوں چلا جیسے منتر کھل کر بلا رہا ہو۔

لو جناب! لڑکی کے سامنے جا کے صاحبزادے کی سانس سکت ختم ہو گئی۔ پہلے تو کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ کر چڑی کے پولے کی طرح لڑکی کو اپنی بانہوں میں اٹھا لیا' اور سینے سے لگا لیا۔ لڑکی نے جب اپنا سر اس کے چوپڈے پر رکھا تو کچے پٹ کی پھلکاری میں اس کی ٹانگیں کیلے کے کچے تنے کی طرح جھولا جھول گئیں۔ صاحبزادہ کچھ سوچے سمجھے اور پوچھے بولے بنا اس کو اٹھا کر حویلی کے باغیچے میں چلتا رہا اور سیدھا اپنی فٹن کے پاس پہنچ گیا۔ لڑکی کو سامنے والی سیٹ پر بٹھایا اور خود دوسری طرف سے ہو کر راسیں سنبھال کے اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ گھوڑے کو ساٹا مارا تو وہ کھڑے پیروں پر بجلی کی طرح چمکا اور ہوا ہو گیا۔ اسے تو آج تک کسی نے پھول بھی نہیں مارا تھا سانٹے کی تڑپ نے بے قرار کر کے سموں میں بجلیاں بھر دیں۔

لو جناب! گھوڑا سنبھالتے سنبھالتے اور راسیں کھینچتے صاحبزادے کے ہاتھ لہولہان

OCIETY.COM

ہو گئے پر اس نے فٹن پر کنٹرول نہ چھوڑا۔ گھنٹوں کا رستہ منٹوں میں طے کر کے مورتی کو سیر کرانے دریا پر لے گیا۔ بیاس جوان جوگی کی طرح گھسن گھیریوں کی نتیاں 'ہنسلیاں اور کنگن پہنے جھاگ اڑاتا بہے چلا جا رہا تھا مویشی چوپائے جانور 'پنکھ پکھیرو کناروں سے دور ہو گئے تھے۔ لہریں ابل ابل کر اردگرد چھپٹے مار رہی تھیں۔ صاحبزادے نے کنارے سے دور فٹن روکی۔ چھلانگ مار کر نیچے اترا اور مورتی کی اور جا کر اپنی بانہیں اس کی طرف پھیلا دیں۔ مورتی بیٹھی کی بیٹھی جھوم کر اس کے ہاتھوں میں آ گئی اور وہ اسے کچے کماد کی بھری کی طرح گود میں اٹھا کر ایک اونچے کنارے کے پاس آ گیا۔ بڑی دیر تک وہ ایک دوسرے کے سنگ موہنڈے سے موہنڈا ملائے باتیں کرتے رہے اور جب صاحبزادہ نے کھڑے ہو کے اس کی گات کے نیچے بانہہ ڈال کر اسے اٹھایا تو مورتی اس کے ہاتھ سے یوں نکل گئی جیسے چتری والے پکے کیلے کے چھلکے سے اس کی گلی نکل جاتی ہے۔ صاحبزادے کے ہاتھ میں کچھ پٹ کی پھلکاری رہ گئی اور اس نے پانی میں گرتی ہوئی اپنی معشوق کے گول اور بھاری کولہے دیکھے جس کے نیچے مچھلی کا دھڑ تھا اور اس پر سونے جیسے رنگ کے جگ مگ جگ مگ کرتے چانے تھے۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں چانے سندھوری بجلی کی طرح چمکے اور پھر پانی میں غائب ہو گئے۔ صاحبزادے نے فریادی تان میں اونچے اونچے اپنی محبوبہ کو پکارا اور بین کرنے لگا۔ جل پری دو تین مرتبہ پانی کی سطح سے اوپر ابھری اور پھر نیچے چلی گئی۔

لو جناب! صاحبزادہ نے واپس کالج جانے سے انکار کر دیا۔ سوٹ بوٹ اتار کر گیروا ابرن پہن لیا اور حویلی کے اندر جوگ دان لے لیا۔ ماں باپ روتے کرلاتے آنکھوں سے لاچار اور حال سے بے حال ہو گئے۔ جن کا ایک اکیلا سوہنا پتر گھر میں رہتے بستے بن باس لے لے ان ماں باپ نے تو جیتے جی ہی مر جانا ہے کہ...... ہونی کے آگے کوئی پیش نہ چلی تو ماں باپ دیواروں سے ڈھو لگا کر موت کی انتظاری کرنے لگے۔ پورے تیس سال چھ سو مربعوں کا مالک اور محل ماڑیوں کا راجکمار پاگلوں اور مجنوؤں کی طرح اپنی جل پری کو تلاش کرتا رہا۔ وہ صبح سویرے منہ اندھیرے دریا کنارے پہنچ جاتا اور شام تک اس جگہ بیٹھا رہتا جہاں اس کی محبوبہ اس کے ہاتھ سے نکل کر دریا میں کود گئی تھی اور پھر تین مرتبہ ابھر کر اور اپنے آخری درشن دے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئی تھی۔

لو جناب! پورے تیس سال اور ایک مہینے بعد جیٹھ کی اسی تاریخ اور شام کے ٹھیک اسی وقت جب مرن ہار صاحبزادہ دریا کنارے سر جھکائے بیٹھا تھا اس کی جل پری معشوقہ نے پانی

WWW.PAKS

سے سر باہر نکالا اور آہستہ آہستہ لہروں کو چیرتی اس کے پاس کنارے کے قریب آگئی۔ اس کی شکل اب وہ پہلے والی نہیں رہی تھی۔ ٹیڑھی آنکھ کے بھینگے پن سے آنکھوں کے دونوں ڈھیلے اور قریب آگئے تھے۔ گہری نیلی آنکھیں سیپ کی طرح سفید ہو گئی تھیں۔ دانتوں میں دو تین نئی درلیں پیدا ہو گئی تھیں۔ ماتھے کا مسہ موٹا بھی ہو گیا تھا اور چھوٹے سے سونڈ کی طرح آگے کو بھی بڑھ آیا تھا۔ سر کے بال کم ہو کر جھالر سی بن گئے تھے اور نیچے کا خوبصورت سنہرا دھڑ جس کے اوپر سرین کا گول گنبد تھا اب سنولا گیا تھا اور پرانی بالٹی کی طرح نظر آنے لگا تھا۔ صاحبزادے نے رو کر کہا "میری جان محبوبہ باہر آجاؤ اور میرے ساتھ چلو' میں نے تمہارے بغیر زندگی کے تیس سال نینوں پرانوں کو ایک طرف رکھ کر گزارے ہیں۔ اب میں زندگی کے آخری دن تمہارے بازوؤں میں گزارنا چاہتا ہوں۔ مجھ پر دیا کرو' باہر آجاؤ' میرے ساتھ چلو اور میرے اندھیرے گھر میں چاننا کر دو۔

صاحبزادہ کی بنتی سن کر جل پری نے انکار میں سر ہلایا اور رونے لگی۔ روتے سارہی اس کی گھگھی بندھ گئی اور ہچکیوں سے اس کے کندھے ہلکورے لینے لگے۔

صاحبزادے نے تڑپ کر کہا "میری جان تم مجھے اس وقت بھی بیاری تھیں جب تمہارے دانتوں میں ورل تھی اور تمہارے ماتھے پر مسا خالی تھا اور اس وقت بھی تم میری جان کا ٹکڑا اور میرے دل کا ارمان ہو۔ اس کی پروانہ کرو کہ تمہارا چہرہ لنک گیا ہے۔ تمہارے دانت ٹوٹ گئے ہیں اور تمہارے چانے کالے پڑ گئے ہیں۔ میں اب بھی تم سے ویسا ہی پریم کرتا ہوں اور تم کو اسی طرح سے چاہتا ہوں۔"

صاحبزادے کی بات سن کر جل پری کی سسکیاں آہوں میں تبدیل ہو گئیں اور پھر ان آہوں سے کراہیں نکلنے لگیں۔ صاحبزادے نے رو کر کہا "بتاؤ میری جان۔ بتاؤ میری سندری۔ میری بجنی۔ من موہنی تم نے مجھے قبول کیوں نہ کیا۔ مجھ میں کیا عیب تھا۔ کیا برائی تھی۔ کیا خرابی تھی؟"

جل پری نے زار زار روتے ہوئے کہا "خرابی تم میں نہیں تھی میرے محبوب' میرے سوہنے راجکمار۔ خرابی مجھ میں تھی۔ تم ایک جاگیر دار کے ایک سردار کے ایک وریام کے بیٹے ہو اور میں تمہارے مزارع حسو تیلی کی بیٹی ہوں۔ میری دوسری ساری خرابیاں تو دور ہو سکتی تھیں پر اس بیماری کا کوئی علاج نہیں تھا کہ میں ایک کمی کمین کی بیٹی ہوں میں کیا کرتی اور تمہاری شان کس طرح مٹی میں ملاتی!"

OCIETY.COM

لاریوں کے اڈے سے لے کر اپنے ہوسٹل تک میں دان سنگھ کی یہ کہانی لفظ بہ لفظ بکھاننا آیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ نہ تو رجنی حسو تیلی کی بیٹی ہے اور نہ ہی جیجاجی کوئی کم برہمن ہیں پھر رجنی کی ساری شان مٹی میں کیوں مل گئی۔ وہ زندگی کے رستے پر چلتی چلتی کال کی لکیر میں کیوں داخل ہو گئی۔ کیا یہ سب میری وجہ سے ہوا۔ اس کی پریت کے کارن ہوا۔ ماسٹر بالی کی بدولت ہوا یا پھر لکھے لکھائے لیکھ کی پوتھی آکاش سے اتری اور اس نے رجنی سے اندھیارے کے پھیرے لے لئے!

WWW.PAKS

۸

ہیروشیما اور ناگاساکی پر یکے بعد دیگرے دو عدد ایٹم بم گرائے جا چکے تھے اور دوسری جنگ عظیم اپنے انجام کو پہنچ چکی تھی۔ ساری دنیا جنگ کے خاتمے پر خوشیاں منا رہی تھی اور ہر اتحادی ملک میں اور اس کے بہی خواہ ممالک میں اپنے اپنے طرز کا چراغاں ہو رہا تھا۔ امریکہ میں جگہ جگہ خوشی کے شادیانے بج رہے تھے اور تھوڑے تھوڑے وقفوں بعد ان شادیانوں کو روک کر ہیروشیما اور ناگاساکی کے بچے کھچے لوگوں کیلئے اظہار ہمدردی کی تقریریں بھی ہوتی تھیں۔ ان تقریروں میں ہیومن رائٹس' آزادی اظہار اور بنیادی انسانی حقوق کا تذکرہ ہوتا اور پھر ہیروشیما اور ناگاساکی کی صفحہ ہستی سے مٹ جانے والی مخلوق کے لئے دعائیں بھی مانگی جاتیں۔ جشن کے جلوسوں میں پادری ساتھ ساتھ چلتے تھے اور نیست و نابود ہو جانے والوں کے لئے مغفرت کی دعا کرتے تھے۔

فتح کی خوشی میں سکولوں' کالجوں اور سرکاری محکموں کو چھٹیاں دی گئیں۔ جگہ جگہ برطانوی جھنڈوں کی سلامیاں اتاری گئیں۔ شاعروں نے تہنیت نامے لکھے۔ اخباروں رسالوں نے خصوصی نمبر شائع کئے چھوٹے چھوٹے علاقوں میں بھی مشاعروں اور قوالیوں کا اہتمام کیا گیا۔ شہر بہ شہر ٹورنگ ڈرامے گھمائے گئے جن میں ہٹلر' مسولینی اور ہیروہتو کا کردار ادا کرنے والوں پر جوتوں' روڑوں' گلی سڑی سبزیوں کی بارش کی جاتی۔ میں ایسے ڈراموں میں تھیلا بھر کر پلپلے ٹماٹر لے جاتا تھا کہ ان کا نشانہ خوب لگتا تھا اور ان کا ملبہ آسانی سے اترتا نہیں تھا۔

ماسٹر بالی کو اس فتح کی ذرہ بھر خوشی نہ ہوئی تھی۔ ڈپٹی کمشنر صاحب نے انہیں ضلع کے فنکشن کے لئے بلایا تو بیمار ہو گئے۔ مقامی ڈاکٹر نے بموجب ارشاد جناب ڈپٹی کمشنر صاحب انہیں چیک کیا تو واقعی شدید پیچش اور مروڑ کے مریض نکلے' انہیں دوا دی گئی تو الٹا اثر ہوا۔ مرض نے شدت اختیار کر لی اور وہ مرتے مرتے بچے۔

OCIETY.COM

میں نے ان سے اس فتح عظیم سے کنارہ کشی کر کے لیٹے رہنے کی بابت پوچھا تو ایک سرد سی آہ بھر کر بولے "کیسی فتح اور کیسی شکست یہ سب کھیل تماشا ہے۔ کچھ اوپر والے نے رچا رکھا ہے۔ کچھ ان مورکھوں نے وقت کاٹنے کو اپنا لیا ہے۔ فتح اس کو نہیں کہتے۔"

"تو پھر کس کو کہتے ہیں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

انہوں نے دو تین مرتبہ مقام قلب پر زور زور سے ہاتھ مارا اور بولے "اسے فتح کرنے کو فتح کہتے ہیں' بندے مارنے کو نہیں۔"

چونکہ ان کا علم محدود تھا اس لیے میں نے آگے بولنا مناسب نہیں سمجھا۔ بھلا بندے مارے بغیر کوئی کس طرح سے فتح حاصل کر سکتا ہے اور دشمن کی پسپائی کے بغیر کیسے اعلان کیا جا سکتا ہے کہ فتح حاصل ہو گئی ہے۔ مدمقابل کو نیست و نابود کیے بنا فتح کا احساس کیونکر ہو سکتا ہے اور بدذن حریف کا قلع قمع کیے کس طرح سے فتح کی خوشی منائی جا سکتی ہے۔

ماسٹر صاحب کئی دن تک بیمار رہے اور بھی دانے کا لعاب اور گوند کثیر اپیتے رہے۔

فتح کی خوشیاں منا چکنے کے چند ہی دن بعد ہندوستان بھر میں سیاست کا بازار گرم ہو گیا۔ کانگرس اور مسلم لیگ نے ایک دوسرے کے سامنے پرے جما لیے اور ان کے درمیان نظریات کی جنگ شروع ہو گئی۔ ہمارے تحت پور میں گو ہندو سکھ آبادی نوے فیصد کے قریب تھی پھر بھی مسلم لیگ خم ٹھونک کر ان کے مقابل آ گئی اور اس نے اپنے حقوق کا علم بلند کر دیا۔ مسلمان تعداد میں کمی' دولت میں صفر' ملازمت میں قلیل اور تعلیم میں برائے نام ہونے کے باوصف ایک طاقت بن کر ابھر رہے تھے۔ وہ ایک طاقت بن کر کیوں ابھر رہے تھے اور اتنی ساری کمزوریاں مل کر ایک بڑی کمزوری کے بجائے طاقت میں کیوں منتقل ہو رہی تھیں ایک راز تھا جس کی سمجھ نہ مسلمانوں کو تھی اور نہ ان کے حریفوں کو۔

مسلمانوں کے حریف زیادہ پڑھے لکھے' زیادہ دولتمند' زیادہ تربیت یافتہ اور سیاست میں بہت ہی آگے بڑھے ہوئے تھے۔ ان کے پاس حالات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی بے پناہ صلاحیت تھی۔ جدوجہد میں وہ مسلمانوں سے بہت آگے تھے۔ ایثار' اخلاص' قربانی اور وطن پرستی کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ زمانہ ان کے ساتھ تھا۔ انگریز انہیں ہر طرح کی رعایت دے رہے تھے اور ان کی مدد پر کمربستہ تھے۔ برطانیہ کانگرس کو ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت سمجھتا تھا اور کانگرس اپنی کہنہ مشقی کی بنا پر ہوا کے گھوڑے پر سوار تھی۔ مالی طاقت کے علاوہ ان کی عددی قوت ایک واضح اور جائز حق کی ترجمان تھی۔ لیکن یہ سارے

عوامل مل کر فیصلہ مسلم لیگ کے حق میں دے رہے تھے اور کانگرس کے سارے نمائندہ ہندسے ضرب کھا کر جواب مسلم لیگ کے حق میں نکال رہے تھے۔ ہندسے ہندو کے تھے حاصل ضرب مسلمان کے کھاتے میں کریڈٹ ہو رہا تھا۔ پانسہ کانگرس پھینکتی تھی گوٹ مسلم لیگ کے گھر کی طرف پگ رہی تھی۔

مسلم لیگ کی اس رقص کناں پیش قدمی پر سب سے زیادہ غصہ ان مسلمان رہنماؤں کو آتا تھا جو قیام پاکستان کے دل سے مخالف تھے اور پاکستان کے لفظ کو برداشت نہیں کرتے تھے' نہ تحریریں نہ تقریریں نہ ان دونوں کے درمیان کسی اور صورت میں لیکن پاکستان کی منزل دندناتی ہوئی اپنے آرزومندوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بالکل اس سٹیشن کی طرح جو ڈاک گاڑی میں چپ چاپ بیٹھے مسافروں کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ مسافر نہ کوشش کر رہے ہوتے ہیں' نہ جہد مسلسل میں مصروف ہوتے ہیں نہ ڈبے کے اندر اچھل کود کر سٹیشن کو آوازیں دیا کرتے ہیں نہ ہم سفروں کو ساتھ ملا کر منزل کی طرف بھاگ رہے ہوتے ہیں۔ بس بیٹھے ہوتے ہیں۔ چپ چاپ خاموش' کچھ اونگھتے ہوئے کچھ سوئے ہوئے کچھ ان دونوں کے درمیان تختوں کے ساتھ ڈھولگائے ہوئے۔ بس ان کی ایک مشترکہ آرزو ایک متفقہ خواہش اور ایک سا سمجھی اچھا ہوتی ہے کہ سٹیشن پر پہنچنا ہے اور سٹیشن خود بخود گھنٹوں کی منزل منٹوں میں طے کر تا ان کی طرف لپکنے لگتا ہے۔ وہ خود منزل کی طرف نہیں بڑھتے منزل ان کی متفقہ خواہش کی ڈور سے بندھی اپنے آپ ان کی جانب کھنچنے لگتی ہے۔

تخت پور کے لوگوں میں اب وہ پہلے والی مصنوعی محبت اور جھوٹے منہ کا بھائی چارہ نہیں رہا تھا۔ حقیقتیں کھل کر سامنے آگئی تھیں اور دوست دشمن کے پرے ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑے ہو گئے تھے۔ رات کے وقت اپنی اپنی بستیوں سے اپنے اپنے نعرے بلند ہوتے اور دن کے وقت لوگ ایک دوسرے سے ملتے ہوئے کترا کر کنی کاٹ جاتے۔

راولپنڈی اور لاہور سے شرنارتھیوں کی نقل مکانی شروع ہوئی تو ہم کو احساس ہو گیا کہ اب ہم تخت پور میں نہیں رہ سکتے۔ اب اس جگہ کو چھوڑ کر جانا ہی پڑے گا۔ چودہ اگست کی رات ٹھیک بارہ بج کر ایک منٹ پر جب آل انڈیا ریڈیو لاہور سے پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس کی اناؤنسمنٹ ہوئی تو تخت پور کے در و دیوار پاکستان زندہ باد اور اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھے۔ صبح اک قیامت کا سماں تھا۔ ہمارے محلے کے ایک کونے میں کمہاروں کے گھروں کو آگ لگا دی گئی تھی اور لوگ چیخیں مارتے نالہ و شیون کرتے اندر کے پکے مکانوں اور پکی

گلیوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔

میں حوصلہ کر کے کسی کو بتائے بغیر گھر سے نکلا اور سیدھا بازار پہنچ گیا۔ کچھ دکانیں بند تھیں اور چند ایک کھلی تھیں۔ بازار میں لوگ موجود تھے لیکن بازار کی رونق نہیں تھی۔ میں لچھو بساطی کی سیڑھیاں چڑھ کر سیدھا ماسٹر صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اپنے کورے گھڑے کے پاس فرش پر اکڑوں بیٹھے گلاس میں پانی انڈیل رہے تھے۔ میں نے فرش پر زور کا پاؤں مار کر تالی بجا کے بجرنگ بلی کا نعرہ مارا تو وہ اسی طرح بیٹھے گلاس بھرتے رہے' نہ لرزے نہ پیچھے مڑ کر دیکھا' نہ پہلو بدلا۔ سر وقد اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور پانی پینے لگے۔

میں نے آگے بڑھ کر کہا "چلئے میرے ساتھ میں آپ کو لینے آیا ہوں۔"

"کہاں؟" انہوں نے گلاس لبوں سے ہٹا کر پوچھا۔

"میرے گھر' ہمارے محلے۔"

"لیکن کیوں؟"

"لیکن کیوں اس لئے کہ یہاں اب آپ کا رہنا خطرے سے خالی نہیں' آپ کو میرے ساتھ چلنا ہو گا۔"

"پھر" انہوں نے پوچھا۔

"پھر یہ کہ کل قافلے کے ساتھ ہم پاکستان روانہ ہو رہے ہیں۔"

"بسم اللہ ضرور جاؤ۔ سکھی بسو۔ پر میں تخت پور نہیں چھوڑ سکتا۔"

"وہ کیوں" میں نے چیخ کر کہا۔

"وہ اس لیے کہ تخت پور تخت پور ہے اور میرا سب کچھ یہیں ہے۔"

"لیکن یہ لوگ آپ کو مار دیں گے۔"

"ماردیں"

"پھر آپ کے پاس کون رہ جائے گا۔"

"پہلے میرے پاس کون رہتا تھا" انہوں نے ہنس کر کہا۔

"آپ یہ بہادری چھوڑیں اور اٹھیں اسی وقت" میں نے چڑ کر کہا۔

"میں نے کب بہادری کا دعویٰ کیا شفائی۔" وہ مسکرا کر بولے "ہم تو گانے بجانے والے لوگ ہیں اور بہادری سے بہت دور رہتے ہیں۔"

میں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا "سرکار یہ باتیں کرنے کا وقت نہیں آپ کو میرے

WWW.PAK

ساتھ چلنا پڑے گا۔"

کہنے لگے "میرا سب کچھ تو ادھر ہے' میں اُدھر جا کر کیا کروں گا؟"

"کیا ہے آپ کا اِدھر سب کچھ؟" میں نے غصے سے پوچھا "زمین۔ مکان۔ جائیداد۔ مربعے؟"

ماسٹر صاحب تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر سر جھکا کر بولے "ادھر میرے باپ کی قبر ہے۔ وہ بیچارا ساری عمر اکیلا رہا اور اکلاپے میں ہی مر گیا۔ اب ایک مرتبہ پھر اسے اکیلا چھوڑ جاؤں! بہت پریشان ہو گا اور گھبرا جائے گا' چڑیا جتنا دل ہے اس کا۔"

میں نے کہا "آپ کا خیال ہے یہ قبریں باقی رہیں گی؟ یہ ڈھیریاں؟ اسی طرح اور اسی حالت میں' بولے "یہی تو قائم رہنے والی چیز ہے۔ انسان بیچارا تو فانی ہے' آج مرا کل دوسرا دن۔"

مجھے ان کی اس بات سے کوئی حیرانی نہ ہوئی۔ حالات ہی اس قدر سنگین تھے کہ انہوں نے سب کے ذہن ماؤف کر دیئے تھے اور ہر ایک کی سوچ گڑبڑا دی تھی۔ خوفزدہ لوگ الول جلول باتیں کرنے لگے تھے۔

ماسٹر صاحب نے ایک الائچی منہ میں ڈالتے ہوئے کہا "یہ جو تقسیم ہوئی ہے ناں' غلط ہوئی ہے' یہ اس طرح سے رہے گی نہیں" مجھے ان کی یہ کافرانہ بات سن کر بہت غصہ آیا۔ منہ سے تو کچھ نہ بولا بس پیچ تاب کھا کر رہ گیا۔

انہوں نے الائچی کا چھلکا آہستگی سے منہ سے نکالا اور کہنے لگا "یہ بابے بڑے طرفدار لوگ ہوتے ہیں الگ الگ نہیں رہ سکتے۔ زندہ لوگ الگ الگ ہو سکتے ہیں ایک دوسرے سے جدا ہو کر زندگی بسر کر سکتے ہیں پر یہ بابے بڑے نسبتی ہوتے ہیں۔ یہ نہ تو اپنی نسبت چھوڑ سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے پیاروں سے بے تعلق ہو سکتے ہیں۔ یہ اپنے سلسلے کے اندر ہی رہتے ہیں۔ تم لوگوں نے بڑی غلط لکیر کھینچ دی ہے' یہ رہے گی نہیں۔"

اگر وہ میرے استاد نہ ہوتے تو شاید اس خطرناک لمحے میں میرا ہاتھ ان پر اٹھ جاتا۔

وہ اپنی دھن میں بولے جا رہے تھے "دیکھو شفائی داتا اپنے پیارے اجمیری سے کتنی دیر الگ ہو کر رہ سکتا ہے۔ اس پیارے سے جس نے ان کے قدموں میں بیٹھ کر چلہ کاٹا اور مراقبہ کیا۔ بابا فرید یہاں پاکپتن میں اس کا بانکا نظام دین دلی میں' یہ کب تک ایک دوسرے سے علیحدہ رہیں گے۔ کیسے ہجر کی سختیاں کاٹیں گے۔ دربار صاحب امرتسر میں' اس کی بنیاد رکھنے والے

OCIETY.COM

میاں میر لاہور میں دربار صاحب کب تک اپنے بابا مستری سے الگ رہے گا۔ یہ تو مورکھ لوگوں کی کم عقلی ہے۔"

میں نے کہا "سرکار یہ تو سکھوں کا اپنا فیصلہ ہے اور انہوں نے اس فیصلے کے ساتھ تلوار بھی گھمادی ہے۔"

ہنس کر کہنے لگے "جلد ہی انہیں یہ تلوار الٹی گھمانی پڑ جائے گی۔ آج نہیں پچاس سال اور سہی۔ پچاس سال بعد نہ سہی سو سال بعد سہی' دو سو سال بعد سہی لیکن اس فیصلے پر نظر ثانی ضرور ہو گی۔ جب تک اجمیر اندر نہیں آئے گا سکون نہیں ہو گا۔ یہ بابے بڑے طرفدار اور جانبدار لوگ ہوتے ہیں اپنوں کو نہیں چھوڑتے!"

اب ان کی ایسی احمقانہ بات کا کیا جواب ہو سکتا تھا۔ میں پاس ادب سے بولا نہیں اسی طرح کھڑا رہا۔ نیچے سکھوں کا ایک جتھہ جو بولے سو نہال ست سری اکال کے نعرے مارتا کرپانیں لہراتا چوک میں آکر ٹھہر گیا۔

ماسٹر صاحب نے کہا "بیٹھ جاؤ اور اس لہر کو گزر جانے دو۔"

جب ہمارا قافلہ رات کے ایک بجے تخت پور سے نکلا تو ہمارے ساتھ بلوچ رجمنٹ کے صرف پانچ سپاہی تھے اور ان کے ٹرک پر برین گن لگی ہوئی تھی۔ قافلے میں تخت پور کے سارے مسلمان تھے سوائے ماسٹر بالی کے!

WWW.PAKS

۹

ہم اپنا آبائی شہر چھوڑ کر لاہور آگئے تھے اور لاہور میں میرا دل نہیں لگتا تھا۔ لاہور ایک بڑا سا شہر تھا۔ اس میں بڑے بڑے لوگ تھے۔ بڑی بڑی عمارتیں تھیں۔ بڑے بڑے راستے تھے اور ہر شخص اپنے آپ کو ہیچ مادیگرے نیست سمجھتا تھا۔ صفاں والے چوک کے جس اجڑے ہوئے گھر میں ہم آکر ٹھہرے وہ آدھا جلا ہوا تھا۔ نیچے کے تین کمرے دھوئے ہوئے تھے اور اوپر کا چوبارہ راکھ کا ایک ڈھیر تھا جس کے گارڈر آڑے ترچھے ہو کر دوسرے گھر کی دیواروں کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ ابا جی کا خیال تھا کہ ہمیں چند روز یہاں قیام کرنا ہوگا پھر جب یہ مار دھاڑ ختم ہو جائے گی اور امن و سکون ہو جائے گا تو ہم واپس تخت پور چلے جائیں گے اور اپنا بند کیا ہوا گھر کھول کر اس میں پھر سے آباد ہو جائیں گے۔

ابا جی کو انگریز پر بڑا اعتماد تھا۔ وہ اس کو منصف، منظم اور اصول پرست قوم سمجھتے تھے اور ہر محاملے میں اس کی تعریف کیا کرتے تھے۔ لیکن گورداسپور کو ہندوستان میں شامل کرنے کے بعد ان کا ماتھا ٹھنکا اور وہ خاموش ہو گئے۔ پھر کشمیر کی جنگ شروع ہو گئی اور انگریز کی اصول پرستی کا بھانڈا عین چوراہے میں پھوٹ گیا۔ تخت پور واپس جانے کا خیال ہوا میں تحلیل ہو گیا اور ہم نے بازار سے نئی چارپائیاں خرید کر زمین سے اپنے بستر اٹھا لئے اور اس گھر میں آباد ہو گئے جس کا آدھا حصہ جلا ہوا تھا۔ جس روز ابا جی عارضی مستقل الاٹمنٹ کی چٹ لے کر آئے تو ہم نے تخت پور کا خیال اپنے دل سے مستقل طور پر نکال دیا اور لاہور کے ہو کر رہ گئے۔

میرے بھائیوں نے گھر کا خرچ چلانے کو چھوٹے چھوٹے کاروبار شروع کر لئے۔ لیکن یہ کاروبار کچھ پھیری کھانے کی نوعیت کے تھے۔ منجھلے بھائی جب دوپہر کے وقت ٹھنڈا دودھ پینے گھر آتے تو ان کی سائیکل پر بہت سے ڈبے اور پیکٹ ہوتے جنہیں وہ ایجنسی کے ڈپو سے

پر سپلائی کرتے تھے اور رسید بک سے رسیدیں کاٹ کر دیا کرتے تھے۔ بڑے بھائی ٹرکوں کی ربڑ واشریں تیار کرنے کی ایک "فیکٹری" میں ملازم ہو گئے تھے جو ان کے کسی دوست کی تھی۔ وہ دوست ان کو دو سو روپے ماہوار دیتا تھا اور دوپہر کے وقت کھانا بھی اپنے ساتھ کھلاتا تھا۔ ابا جی زیادہ وقت مسجد میں گزارتے اور مغرب کے بعد گھر آتے۔

جس گھر میں ہم رہتے تھے اس میں بجلی نہیں تھی۔ پہلے تھی، لیکن گھر کو آگ لگ جانے کی وجہ سے کچھ تاریں جل گئی تھیں اور باقی کی کاٹ دی گئی تھیں۔ ایک لالٹین مستقلاً رسوئی میں رہتی اور دوسری ضرورت کے مطابق کمروں میں گھومتی رہتی۔ منجھلے بھائی نے دو تین مرتبہ بجلی کا کنکشن حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ان کو کامیابی نہ ہوئی۔ سفارش کنندہ ان سے گیارہ روپے لے کر بھی یہ کام نہ کر سکا اور شرمندہ ہو کر غائب ہو گیا۔ اماں نے مجھے بے مصرف، بیکار اور آوارہ گرد نوجوان سمجھ کر یہ ڈیوٹی میرے ذمہ لگا دی کہ میں ہر روز بجلی کے دفتر جایا کروں اور کنکشن حاصل کرنے کی کوشش کیا کروں۔ میں ان کے حکم کے مطابق صبح ناشتہ کر کے گھر سے نکل جاتا اور سڑک کنارے لٹی ہوئی کتابوں کے انبار سے لطف اندوز ہو کر شام کے وقت واپس گھر آ جاتا کہ آج کام نہیں بنا۔ کل شاید کوئی واضح صورت نظر آ جائے۔ کوئی ہفتہ دس دن تک مجھے اس بات کا علم بھی نہ ہو سکا کہ بجلی کا دفتر ہے کہاں اور کنکشن حاصل کرنے کے لئے کیا کیا جاتا ہے۔ اصل میں میں نے یہ علم حاصل کرنے کی زحمت ہی گوارا نہ کی۔ سڑک کنارے ایسے اچھی اچھی اور اتنی سستی کتابیں دستیاب تھیں کہ دن گزرنے کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔

ایک شام جب میں بڑے بھائی کی جرح پر اپنے مشن کا کوئی شافی جواب نہ دے سکا تو اگلی صبح ریگل چوک پر لٹی ہوئی کتابوں کی نئی کھیپ سے آنکھیں بند کر کے آگے گزر گیا۔

بجلی کا دفتر میکلوڈ روڈ پر صنوبر سینما کے سامنے واقع تھا اور اس کے ایک کنارے پر کچے قیمے کی ٹکیاں تلنے والے کا بڑا سا توا ہلکا ہلکا دھواں اور تیز تیز خوشبو چھوڑ رہا تھا۔ پہلے تو میں نے اس سے دو ٹکیاں اور ایک نان لے کر دوبارہ ناشتہ کیا پھر بسم اللہ پڑھ کر دفتر کے احاطے میں داخل ہو گیا۔

دفتر کے اندر ضرورت مندوں، امیدواروں، سائیلوں اور ایجنٹوں کا ایک جم غفیر تھا۔ کچھ لوگ عرضیاں لکھ رہے تھے کچھ لکھوا رہے تھے۔ کہیں سودے طے ہو رہے تھے اور کچھ لوگ درختوں کی چھاؤں تلے سو رہے تھے۔ میں نے ایک بزرگ سے بجلی کا کنکشن حاصل

WWW.PAKS

کرنے کی بابت پوچھا تو انہوں نے کہا کہ اگر ایگزیکٹو انجینئر سے کوئی واقفیت ہے تو یہ کام ہو سکتا ہے ورنہ مشکل ہے۔

میں اپنی مشکل کو ساتھ لے کر بڑی دیر تک ادھر ادھر گھومتا رہا۔ اب ہم دو ہو گئے تھے۔ ایک میں اور ایک میری مشکل۔ جدھر جاتا میری مشکل دم ہلاتی میرے پیچھے پیچھے چلی آتی۔ بیٹھ جاتا تو میرے ساتھ میرے قدموں کے پاس بیٹھ جاتی۔ اٹھ کر چلنے لگتا تو پھر دم ہلاتی میرے پیچھے پیچھے بھاگنے لگتی۔ مشکل کا ساتھ ہو تو آدمی اکیلا نہیں رہتا۔ اس کو کوئی اور دکھ ہو تو ہو اکلاپے کا روگ نہیں رہتا۔ جیسے کوئی برات میں شامل ہونے کے لئے اکیلا گھر سے آئے اور اسے انجان لوگوں کے گروہ میں ایک ایسا پرانا دوست مل جائے جو کونے میں اکیلا کھڑا ہو۔ تنہائی سے نجات حاصل کرنے کے لئے مشکل کا ساتھ سب سے پاکیزہ، پیارا خوشگوار اور مخلص ساتھ ہوتا ہے اس لئے تنہا لوگ اپنا دل لگانے کے لئے کوئی نہ کوئی مشکل ہر وقت اپنے ساتھ لگا رکھتے ہیں۔ کچھ انگلی پر بٹھا کر کچھ اس کے گلے میں پٹہ ڈال کر!

ایگزیکٹو انجینئر کے دروازے پر ایک زبردست قسم کا چپراسی کھڑا تھا جس کا کام سائیلوں کو اندر جانے سے روکنا تھا۔ میں آگے بڑھا تو اس نے مجھے بھی اندر جانے سے روکا۔ میں نے اونچی آواز میں انگریزی زبان میں کہا مجھے صاحب سے ملنا ہے اور ایک ضروری کام سے ملنا ہے۔ اس نے پنجابی میں ہاتھ آگے بڑھا کر میرا راستہ روک دیا۔ میں نے اور اونچی انگریزی میں اندر جانے کیلئے زور لگایا تو اس نے پنجابی میں دونوں ہاتھ پھیلا کر مجھے پیچھے دھکیل دیا۔ میں نے بایاں ہاتھ اوپر اٹھا کر اپنی انگریزی کا والیوم اور اونچا کر دیا۔ پیشتر اس کے کہ وہ پنجابی میں ایک زوردار لپڑ میرے منہ پر مارتا صاحب کی گھنٹی بجی اور وہ اندر چلا گیا۔

بہت سے لوگ میرے اردگرد جمع ہو گئے تھے اور مجھے چپراسی کے ساتھ فل ناس لڑائی پر اکسا رہے تھے۔ میں اپنی ٹوٹی ہوئی انگریزی کی گرامر پر غور کر رہا تھا جس میں صیغوں، حرفوں اور فعلوں کی بیشمار غلطیاں سرزد ہو گئی تھیں اور ان لوگوں کی شکلیں دیکھ رہا تھا جو مرعوب صورت بنائے اور عقیدت کے ساتھ سر جھکائے میرے اردگرد حلقہ باندھے ووٹروں کی طرح کھڑے تھے اور مجھے ایک عظیم ہیرو سمجھ رہے تھے۔

چپراسی چق اٹھا کر اور سر جھکا کر باہر نکلا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا "چلو! صاحب اندر بلاتے ہیں" لوگوں نے خوشی کا ایک نعرہ مارا اور میں صاحب کے دفتر میں داخل ہو گیا۔

OCIETY.COM

صاحب ایک بڑے سے آبنوسی میز کے پیچھے ایک مضبوط سی کرسی پر براجمان تھے اور چائے پی رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے ایک بے تکلف دوست دانے دار چینی لگے بسکٹ چائے میں بھگو بھگو کر کھا رہے تھے۔ ایگزیکٹو انجینئر صاحب نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں نے بجلی کے کنکشن کی عرضی ان کے سامنے ڈال دی۔ انہوں نے چائے کی ایک پیالی بنائی' پرچ میں کچھ بسکٹ رکھے اور میری طرف بڑھادی۔ عرضی پڑھنے کے بعد انہوں نے کمال مہربانی سے فرمایا کہ ہمیں آپ کے گھر کی وائرنگ دیکھ کر کنکشن دینا ہوگا۔ اگر تو وائرنگ ٹھیک ہے پھر تو آج ہی کنکشن مل جائے گا اور اگر وائرنگ میں کوئی نقص ہے یا جل چکی ہے یا شارٹ سرکٹ ہے تو پھر آپ کو چند دن انتظار کرنا پڑے گا تاکہ آپ وائرنگ درست کروالیں اور ہم سے سرٹیفکیٹ حاصل کرلیں۔

میں اپنی وائرنگ کی صحیح صورتحال کا نقشہ کھینچنے ہی والا تھا کہ انہوں نے پیش بندی کرتے ہوئے کہا "میں اپنے آدمیوں کو آپ کے ساتھ بھیج دیتا ہوں۔ یہ موقع دیکھ کر اصل صورت سے مجھے آگاہ کردیں گے اور آپ کا کام ہو جائے گا۔" چائے پی کر اور انجینئر صاحب کا شکریہ ادا کر کے جب میں باہر نکلنے لگا تو انہوں نے گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "کنکشن ملتے ہی آپ کو ایک مرتبہ پھر میرے دفتر آنا پڑے گا تاکہ چند ضروری کاغذات پر آپ کے دستخط ہو جائیں۔" پھر انہوں نے مسکرا کر کہا "ایسا نہ ہوا تو آپ کا کنکشن پھر کٹ جائے گا اور آپ ویسے کے ویسے رہ جائیں گے۔ میں نے اپنے چپراسی سے کہہ دیا ہے' آئندہ آپ اس سے پوچھے بنا سیدھے میرے کمرے میں آجایا کریں گے۔"

جب میں صاحب کے کمرے سے باہر نکلا تو چار آدمیوں کا ایک گینگ چھوٹے سے ٹرک میں سیڑھی پوڑی اور دوسرا ساز و سامان لگا کر میرا منتظر کھڑا تھا۔

ایس ڈی او صاحب مضبوط بدن کے گندمی رنگ اور درمیانے قد کے ایک شریف سے انسان تھے۔ کالی سیاہ چمکدار ڈاڑھی' اعلیٰ درجے کا سلک سوٹ' پھن دار نیلی اور سرخ ٹائی۔ پاؤں میں پیٹنٹ لیدر کے قیمتی جوتے اور کھونٹی سے لٹکتا ہوا نیا سولہیٹ ان کے گینگ نے دو دن لگا کر سارے گھر کی نئی وائرنگ کردی' نئے ہولڈر اور سوئچ لگا دیئے۔ ڈبے میں بند ایک نیا سوئچ بورڈ دیوار پر فکس کردیا اور جب میں نے ان سے اخراجات کا بل مانگا تو انہوں نے بتایا کہ ایس ڈی او صاحب نے خود ساری پے منٹ کردی ہے۔

ہمارے گھر بجلی چالو ہو گئی تو ضروری کاغذات پر دستخط کرنے کی غرض سے میں

WWW.PAK

ایس ڈی او صاحب کے دفتر گیا۔ دفتر میں کچھ سائیل جمع تھے۔ ایس ڈی او صاحب نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور سائیلوں کے تقاضے نمٹانے لگے۔ جب کمرہ خالی ہو گیا تو انہوں نے چپراسی کو بلا کر حکم دیا کہ ابھی کسی اور کو اندر آنے نہ دینا۔ پھر تھوڑی دیر بغور میری طرف دیکھتے رہے اور آہستگی سے بولے "آپ کے ایک دوست تھے فلوٹ بجانے والے۔"

میں ان کی یہ بات سن کر سناٹے میں آ گیا اور بڑی دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔ انہوں نے پھر پوچھا "آپ کے ایک دوست تھے بانسری بجانے والے۔"

میں نے کہا "وہ میرے دوست نہیں تھے میرے استاد تھے ماسٹر بالی۔ اقبال حسین کلارنٹ نواز۔ وہ فلوٹ نہیں بجاتے تھے کلارنٹ بجاتے تھے۔"

"وہ کہاں آباد ہوئے ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"وہ تخت پور سے ہمارے ساتھ نہیں آئے وہیں رہ گئے ہیں۔"

"وہیں!" ان کی چیخ سی نکل گئی۔ "ان کو تو مار دیا ہو گا۔"

"نہیں وہ ہیں تو زندہ لیکن ان کی کوئی تازہ خبر مجھے معلوم نہیں۔"

"جب ان کی کوئی تازہ خبر معلوم نہیں تو پھر آپ کس طرح سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں۔"

"کوئی مہینہ بھر پہلے میرے خط کے جواب میں ان کا ایک کارڈ آیا تھا۔"

"بہت ممکن ہے اب تک ان کو ختم کر دیا گیا ہو۔"

"ممکن ہے آپ ٹھیک کہتے ہوں لیکن میرا دل کہتا ہے کہ وہ زندہ ہیں۔"

"آپ نے پھر نہیں لکھا۔"

"پھر تو نہیں لکھا" میں نے کہا۔ "لیکن کل پرسوں تک پھر لکھنے کا ارادہ ہے۔"

"اب کی بار خط لکھیں تو ان کو میرا اسلام ضرور عرض کر دیں۔"

میں حیرت سے ایس ڈی او صاحب کا چہرہ تکنے لگا۔ کچھ خدوخال ایسے تھے جو مانوس ضرور نظر آتے تھے لیکن سارے چہرے کے چوکھٹے میں ڈزالو ہو کر جھائیں مائیں سے کرنے لگتے تھے۔ جب میں بڑی دیر تک ان کے چہرے کو اسی طرح تکتا رہا تو انہوں نے مسکرا کر کہا "آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔"

"جی نہیں۔ بالکل نہیں" میں نے اعتراف کیا۔

OCIETY.COM

کہنے لگے "میں وہی شخص ہوں جس نے بھائی گور بخش سنگھ کی دکان سے قرآن شریف چرایا تھا اور پھر آپ لوگوں نے اس کا ہدیہ ادا کر کے مجھے چھڑایا تھا۔"

میں پتھر کا بت بنا بیٹھا تھا اور ایس ڈی او صاحب کہہ رہے تھے۔ "اس روز لوگوں نے مجھے بہت مارا تھا اور اگر آپ دونوں میری مدد کو نہ پہنچتے تو شاید مار مار کر وہ مجھے مار ہی دیتے۔ مار نہ دیتے تو تھانے ضرور لے جاتے۔ میرا والد ایک غریب لکڑہارا تھا جو بیکار درخت خرید کر ان کا ایندھن بنا کر بیچا کرتا تھا۔ لیکن اس سے اس کو کوئی خاص آمدنی نہیں ہوتی تھی۔ گھر میں ایک وقت چولہا جلتا اور کاٹھ کا کام کرنے کے باوجود ہم کھاٹ پر نہیں سوتے تھے۔ اگر آپ میری مدد نہ کرتے اور لوگ مجھے تھانے لے جاتے تو میرے والد نے شرم سے مر جانا تھا۔ وہ بڑا غیرت مند بابا تھا۔"

WWW.PAK

۱۰

کشمیر کی جنگ شدت اختیار کر گئی اور پاکستانی افواج نے افغان مجاہدوں کی مدد سے کشمیر کا بہت سارا علاقہ بھارتی غاصبوں سے آزاد کرا کے اس کا نام آزاد کشمیر رکھ لیا تھا۔ آزاد کشمیر میں ایک پرانے ٹرانسمیٹر کو جوڑ جاڑ کر اڑتالیس اعشاریہ چار میٹر پر ایک چھوٹا سا شارٹ ویو ریڈیو سٹیشن قائم کر دیا گیا جہاں آزادی کے ترانوں کے ساتھ ساتھ حریت پسندوں کے انٹرویو۔ سرینگر سے بھارتی پراپیگنڈے کے دندان شکن جواب۔ جذبہ حب الوطنی کے فیچر اور چھوٹے چھوٹے ڈرامے بھی نشر ہوتے تھے۔ اس ریڈیو سٹیشن پر آل انڈیا ریڈیو کے نامور صدا کار محمد حسین تاج۔ نور اور امیر خان جیسے باکمال لوگ جمع ہو گئے تھے اور ان کو فیڈ کرنے کے لئے یوسف ظفر، ممتاز مفتی، اعجاز بٹالوی اور ممتاز ملک جیسے سکرپٹ رائٹر آستین چڑھائے ہر وقت مستعد رہتے تھے۔

تخت پور کے زمانے میں میں نے چند افسانے ادبی دنیا کے لئے لکھے تھے جن پر مولانا صلاح الدین نے اپنے مشفقانہ نوٹ چڑھا کر کچھ اس طرح سے شائع کیا کہ میں ذرا وقت سے پہلے اور ضرورت سے زیادہ ادبی حلقوں میں متعارف ہو گیا تھا۔ جب اعجاز بٹالوی آزاد کشمیر ریڈیو چھوڑ کر ولایت گئے تو ان کی جگہ کانٹریکٹ پر مجھے عارضی نوکری مل گئی۔

پہاڑوں سے میرا تعارف آزاد کشمیر ریڈیو کی بدولت ہوا اور میں ان کے جادو سے ایسا مسحور ہوا کہ میرا سارا ماضی ان کے سامنے بے معنی سا ہو کر رہ گیا۔ ریڈیو سٹیشن پہنچ کر سکرپٹ لکھنا اور پھر سارا وقت پہاڑوں کے ارد گرد اوپر نیچے، آگے پیچھے گھومنا اور مسلسل گھومنا۔ اس سحر آلود زندگی نے مجھ پر کچھ ایسا اثر کیا کہ میں نے ماسٹر بالی کو دو تین خط لمبے لمبے اور تاثیر سے بھرے لکھ کر روانہ کئے۔ جن میں ادب کی چاشنی بھی تھی اور سکرپٹ رائٹنگ کا کمال بھی تھا۔ ان کے جواب میں استاد کا ایک مختصر سا خط آیا جس میں میرے کمال فن کی داد بھی تھی اور میرے ادیب بن جانے کی سراہنا بھی تھی۔ ساتھ ہی انہوں نے تخت پور کے

حالات بھی لکھے تھے جن میں اداسی کا عنصر نمایاں تھا۔ ان کے جواب کے تیسرے روز ممتاز مفتی نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا کہ تھانے سے ایک سفید پوش اہلکار آیا تھا جس نے میری بابت مفتی سے کچھ استفسار کیا تھا۔ وہ کسی خط کا تذکرہ بھی کر رہا تھا جو مجھے ہندوستان سے آیا تھا اور جس سے میرے بھارت کے ایک نے نواز سے تعلقات کا پتا چلتا تھا۔ مفتی نے کہا "اس نوکری پر رہ کر تم دشمن ملک کے لوگوں سے خط و کتابت نہیں کر سکتے۔ یہ بڑا سریع الحس مقام ہے، تمہیں محتاط رہنا ہوگا۔"

میں نے استاد مکرم سے خط و کتابت کا سلسلہ منقطع کر دیا اور پہاڑوں کے طواف میں شدت پیدا کر دی! کوہالہ روڈ پر جھیکا گلی سے بہت آگے ایک چھوٹی سی سطح مرتفع پر بابا سنگل شاہ کی کٹیا تھی جس میں ایک کیم شحیم جٹا دھاری جوان کئی من ڈیڑھ من وزنی موٹے موٹے سنگل پہن کر اونچے اونچے کوک فریاد کیا کرتا تھا۔ لاریاں اور ٹرک اس جگہ رک کر بابا سنگل کی سلامتی اتارتے تھے اور ڈرائیور اپنے کلینز کو موسم کے میوے دے کر کٹیا تک بھیجا کرتا تھا۔ کلینز اشیائے خوردنی کٹیا سے بہت دور رکھ کر الٹے پاؤں واپس بھاگ آتا کہ بابا گالیاں بھی دیتا تھا اور پتھر بھی مارتا تھا۔ یہ بابا انسانوں اور انسانی رشتوں کا دشمن تھا اور ہر ہر رشتے کا نام لے کر اونچے اونچے گالیاں بکتا۔ خاص طور پر بھائی کا نام آ جانے پر اتنے زور سے چلاتا اور اس قدر چیختا کہ چیڑھ کے درختوں پر بیٹھے ہوئے پہاڑی کوے بھی اپنا ٹھکانہ چھوڑ کر وادی میں پھیل جاتے تھے۔ بڑے زور زور سے سنگل کھڑکاتا تھا اور بھائی کو ماں بہن کی گالیاں دیتا تھا۔ میں ہر دوسرے تیسرے اس کی کٹیا سے دور کھڑے ہو کر اس کا چیخنا چلانا اور گالیاں بکنا مزے لے لے کر سنا کرتا۔ اس کو بھی اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ کوئی باقاعدگی سے آ کر اس کا واویلا سنتا ہے اور داد دیتا ہے۔ جب میرا حوصلہ اور اس کا التفات بڑھا تو ہم ایک دوسرے کے قریب ہونے لگے۔ پہلے یہ قربت صداکاری سے بڑھی۔ ادھر سے وہ گالی دیتا ادھر سے میں کھرج میں تان اٹھاتا۔ وہ بھائی کو گالی دیتا میں بھائی کے بھائی کو گالی نکالتا۔ وہ خاموش ہو جاتا تو میں طرح دیتا۔ وہ گرجتا تو میں چند فٹ اور کھسک کر کٹیا کے قریب ہو جاتا۔

ایک روز اس نے مجھے بہن کی گالی دے کر اونچی آواز میں کہا "سور دیا بچیا نیڑے آ جا۔"

میں اس کے نیڑے آ گیا تو اس نے سنگل کا ایک سرا کھڑکا کر کہا "ہور نزدیک آ جا۔"

میں ہور نزدیک ہو گیا تو مجھے دیکھ کر ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی کافی غلیظ اور فحش قسم کی تھی۔ اپنی دونوں ٹانگیں کھول کر اور گود کی طرف اشارہ کر کے بولا "یہاں آ جا میں تجھے گھوڑے کی سیر

WWW.PAK

کراؤں۔" ہمارے گھر میں تخت پور دو گھوڑے تھے مگر میں نے کبھی ان کی سواری نہ کی تھی۔ مجھے گھوڑے کے قد بت اور سائز سے ویسے ہی خوف آتا تھا اس لیے میں بابا سنگل کے گھوڑے سے خوفزدہ ہو کر واپس آگیا۔

اب ریڈیو سٹیشن پر کام کافی بڑھ گیا تھا۔ نظامی صاحب نے دو نئے فیچر شروع کر دیے تھے جن میں سے ایک کی پوری ذمہ داری مجھ پر ڈال دی تھی۔ سکرپٹ لکھنا' کاپیاں کروانا' ریہرسل لینا اور شام کو اپنی نگرانی میں براڈکاسٹ کروانا تقریباً سارا دن لے لیتا تھا۔ میری سیریں اور کوہ نوردیاں یک قلم موقوف ہو گئیں اور میں صرف دفتر کا ہو کر رہ گیا۔ پہاڑوں کے وہ لمبے لمبے راستے جنہوں نے زندگی کو وسعت عطا کی تھی محدود ہو کر ریڈیو سٹیشن کی تنگ وادی میں گھر گئے تھے اور میں کام کرنے سے کچھ گھبرانے اور کسی حد تک کترانے لگا تھا۔

ایک شام میں نے بابا سنگل شاہ کو عقیدت مندوں کے گروہ میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کشمیر پوائنٹ کی طرف آتے دیکھا تو میں سڑک کنارے ایک پتھر سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ جھکا گلی کی جانب سے اسی طرح لشتم پشتم چلتا اور سنگل کھڑکاتا یہاں تک پہنچا تھا اور اس کے عقیدت مند سینوں پر ہاتھ باندھے اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ جب وہ میرے محاذ میں پہنچا تو رک گیا۔ پھر اونچی آواز میں ہنسا۔ میری طرف اشارہ کر کے ایک کڑک دار ماں کی گالی دی اور بولا "اوئے دنیادار 'کتیا' کا میا کر ودھیا! فقیر کے پاس آنے سے ڈر گیا! پھر دنیا پکڑلی۔ پھر دھوتو کا ہو کر رہ گیا!

پتہ نہیں اس کو کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ میں دھوتو کی ملازمت کرتا ہوں اور میری نوکری نے مجھے پہلے کے مقابلے میں اور زیادہ مصروف کر دیا ہے۔ میں نے اس کی بات کا تو کوئی جواب نہ دیا البتہ اس کے قریب جانے کا پھر سے حوصلہ نکال لیا۔

بابا سنگل شاہ کی عمر 38 برس کی تھی اور اس کا نام محمد الیاس تھا۔ دوفتح گڑھ چوڑیاں کے ایک کھاتے پیتے زمیندار گھرانے کا فرزند تھا اور جوانی میں ہی اس کی اللہ سے لو لگ گئی تھی۔ وہ خدا کی تلاش میں گھر سے نکلا اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پی کر خالی ہاتھ گھر واپس آگیا۔

بابا اپنی کٹیا کے باہر کچھ اس سنجیدگی سے باتیں کر رہا تھا کہ مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا یہ وہی گالیاں دینے اور گند بکنے والا انسان ہے۔ اس کی ہیئت کذائی وہی تھی لیکن اس پر مسکراہٹ کی ایک سفید بدلی سایہ فگن تھی۔ اس کے سنگل اتنے ہی موٹے اور ویسے ہی غلیظ تھے لیکن ان کے آنکڑوں میں ریشم کی لسلساہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے لہجے میں ایک